تذکرہ حضرت شاہ آغا محمدؒ

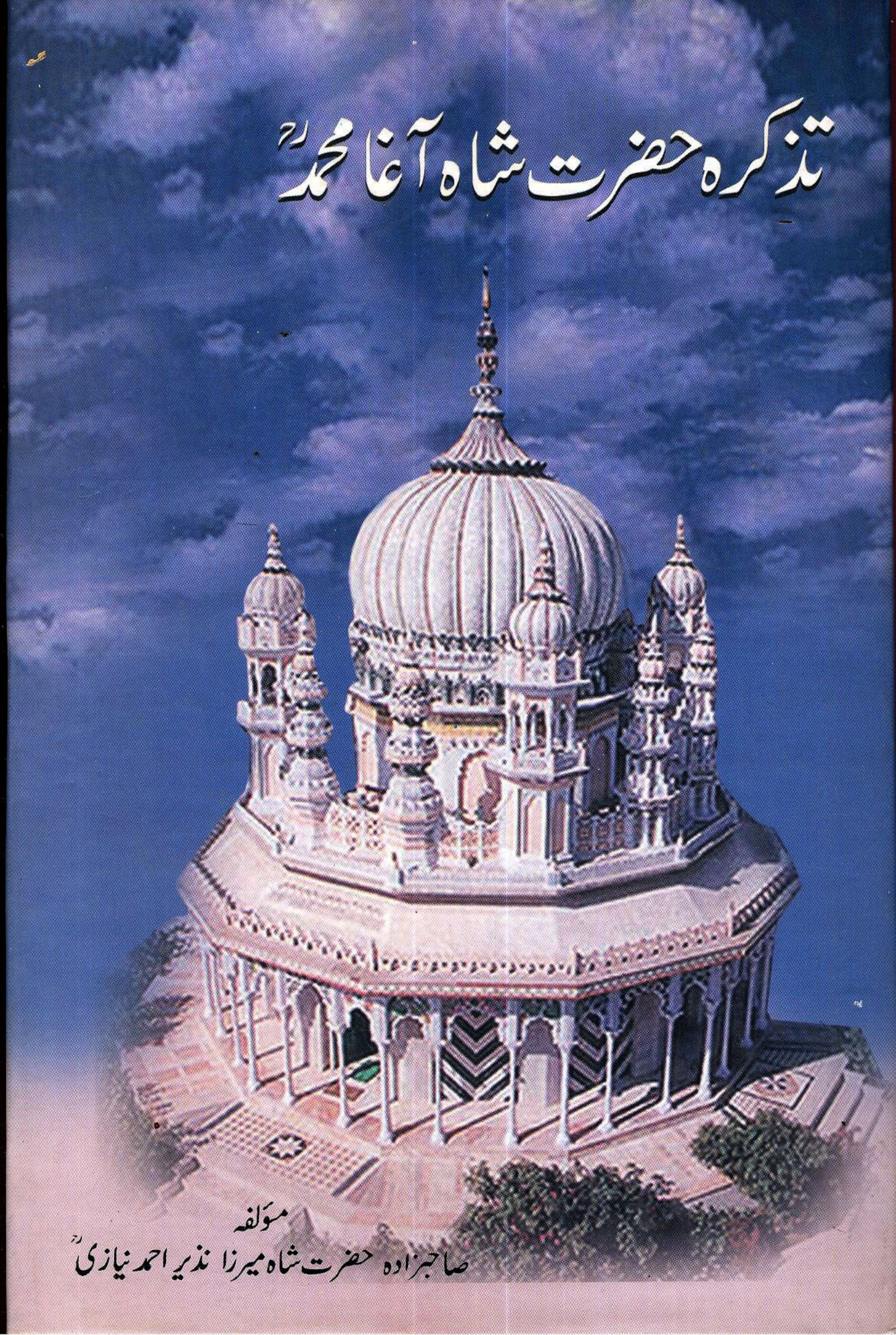

مؤلفہ
صاحبزادہ حضرت شاہ میرزا نذیر احمد نیازیؒ

تذکرہ

حضرت شاہ آغا محمدؒ

لکھنوی ثم جبلپوری۔ قدس سرہ العزیز

یعنی

مفصل حالات وسوانح حیات قدوۃ الواصلین، زبدۃ العارفین

باقی باللہ فانی فی اللہ حضرت قبلہ شاہ میرزا آغا محمدؒ

قادری چشتی نظامی صابری سہروردی نقشبندی (قدیمہ) نیازی نظامی

لکھنوی ثم جبلپوری۔ قدس سرہ العزیز

مؤلفہ

صاحبزادہ مولوی حضرت شاہ میرزا نذیر احمد قادری چشتی نیازی نظامی علیہ الرحمۃ

مع اضافہ وترمیم

حضرت میرزا مصطفیٰ حسین علیہ الرحمۃ فرزند ارجمند صاحب تذکرہؒ

و

ڈاکٹر میرزا اختیار حسین نبیرہ صاحب تذکرہؒ

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب ..... تذکرۂ حضرت شاہ آغا محمد

اشاعت اوّل ۱۹۶۷

اشاعت دوم ..... ۲۰۰۴ء - ۱۴۲۵ھ

کمپوزنگ ..... احمد گرافکس، کراچی

طباعت ..... ویلکم بک پورٹ، کراچی

سرِ ورق ..... برائٹ گرافکس

ہدیہ .....

زیر اہتمام ..... جماعت سالکین، خانقاہ آغائیہ مرتضویہ ٹرسٹ، کراچی

E-mail : mail@agharang.org
Web : www.agharang.org

ملنے کا پتہ

(۱) ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی۔
فون: 021-2639581/2633151
فیکس: 021-2638086
E-mail: wbp@welbooks.com

(۲) مکتبۂ رضویہ، گاڑی کھاتہ، کراچی۔
فون: 2627897, 2216464

(۳) ضیاء القرآن پبلی کیشنز، اردو بازار، کراچی۔
فون: 2630411, 2212011, 2210212

فہرست

مقدمہ ۷

دیباچہ ۳۴

ابتدائی اور خاندانی حالات ۴۱

آپ کا بچپن ۴۴

واقعہ ۵۰

تلاش حق میں آپ کا گھر سے نکلنا ۵۴

باندہ میں حاضری ۵۹

شرف بیعت اور تحصیل علوم ظاہری و باطنی ۵۹

مولوی احسان الحق صاحبؒ کا حضرت صاحبؒ کو بیٹا بنانا ۶۰

حضرت شاہ صاحبؒ کا وصال اور آپ کی سجادگی ۶۲

جبل پور میں آپ کی تشریف آوری ۶۵

حضرت تاج الاولیاءؒ کی خدمت میں بریلی شریف کی حاضری ۷۴

فتویٰ'' والا نامہ حضرت تاج الاولیاء رحمتہ اللہ علیہ'' ۷۶

عطیات ۸۲

ریاضت ومجاہدہ ۸۵

عام معمولات اور اس میں سختی سے پابندی ۹۱

نسبت، سیّدوں اور صاحبزادوں کا احترام ۹۵

فاتحہ وغیرہ کے متعلق معمولات ۹۹

تعظیم سادات و صاحبزادگان ۱۰۳
استغنا و توکّل ۱۰۷
سیرت و کردار کے بعض دیگر پہلو ۱۲۳
چند نصائح ۱۴۰
تصرفات و خرق عادات ۱۴۶

ضمیمہ۔۱ ..... ۱۵۹
تصرفات و خرق عادات ۱۶۱
وصال مبارک ۱۸۰

ضمیمہ۔۲ ..... ۱۸۷
شجرۂ طریقت ۱۸۸
ذوقِ سخن ۱۹۳
جانشینی ۱۹۷
اہل و عیال ۲۰۱
تعمیر مزار مبارک ۲۱۰

مقدمہ

اسلامی تصوف

تعریف

تصوف کی تعریفیں ایک زمانہ سے ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ اور ہر اس مصنف نے جس نے تصوف کے متعلق کچھ تحریر کیا تصوف کی تعریف کسی نہ کسی انداز سے کی۔ یہاں تک اگر تمام تعریفوں کو جمع کیا جائے تو ایک خاصا انبار ہو جائے۔ کسی علم یا فن کی اتنی زیادہ تعریفوں کا مطلب یہی ہے کہ اس کی کوئی ایک تعریف ممکن نہیں۔ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ اسلامی تصوف کو اسلام سے علیحدہ ایک علم تصور کیا گیا ہے اور بہ لحاظ فن ہر شخص نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق مختلف تعبیریں اس پر چسپاں کی ہیں اس کی ''تاریخ'' اس کے ''غیر اسلامی ماخذ'' اور اس کے ''ارتقاء'' کی تفصیلات اسی غلط نظریے کی بناء پر بیان کر کے غلطیوں اور غلط فہمیوں کے انبار کے نیچے قرآنی اور اسلامی تصوف کو دفن کر دیا گیا ہے۔ میرے خیال میں جس طرح خوشبو کے بغیر گلاب کا اور سنگھار کے بغیر دلہن کا تصور کوئی معنی نہیں رکھتا، اسی طرح تصوف کے بغیر (جو اسلام میں خدا رسی کے علم و فن کا مجموعہ ہے) اسلام بے معنی بن جاتا ہے۔ اسلامی تصوف اسلام کی خوشبو اور اس کا سنگھار ہے۔ اس کا حسن و جمال بلکہ کمال ہے۔ وہ **الا للہ الدین الخالص** (واسطے اللہ کے ہے خالص عبادت) کی تصدیق ہے۔ **الیٰ ربک کدحا فملقیہ ط** (اپنے رب کی طرف خوب محنت کر پس ملنے والا ہے تو ساتھ اس کے) کی تعمیل ہے۔ **الیٰ ربک منتھٰھا** (تیرے رب کی طرف ہے انتہا اس کی) کی تکمیل ہے۔

مذکورہ بالا بیان کے پیش نظر اسلام کی تعریف عین تصوف کی تعریف ہے اور چوں کہ ''اسلام'' کی تعریف کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں کی جاتی اسی طرح تصوف کی تعریف

بھی بیان اور اعلان سے بالا ہے اور اگر کوئی تعریف ضروری ہی ہے تو اس سے بہتر اس کی تعریف نہیں ہوسکتی کہ اسلام کی روح کو سمجھنے اور اسے اپنا کر منزل مقصود تک پہنچنے کا دوسرا نام اسلامی تصوف ہے۔

اسلام کا کوئی رکن بھی ہو اس کا قطعی یہ مقصد نہیں ہے کہ انسان صرف ظاہری رسوم اور آداب میں الجھ کر رہ جائے اور اس کی روح و نصب العین کو فراموش کر دے۔ کوئی صاحب بصیرت اس ظاہر پرستی کا قائل نہیں ہوسکتا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے مغز کو چھوڑ کر قشر (چھلکے) پر اکتفا کی جائے۔ اسلام کے بنیادی ارکان کلمہ، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج سب اپنے اندر معانی حقیقی کا ایک خزانہ رکھتے ہیں جس کے بغیر ان ارکان کی ادائیگی جسم بے روح کے مترادف ہے۔

اگر ارکان ظاہری کے ساتھ نماز میں خشوع اور خضوع یا روزہ میں تزکیہ نفس کا جذبہ شامل نہیں ہے تو بموجب آیات و احادیث نماز محض بے مقصد حرکاتِ جسم اور روزہ محض فاقہ رہ جاتا ہے۔ یہی خشوع و خضوع اگر عشق الٰہی کی بنیادوں پر قائم ہے اور تزکیہ نفس کا مقصد رضائے الٰہی اور قرب حق کا حصول ہے تو کون کہہ سکتا ہے کہ یہ تصوف عین اسلام یا اسلام کی روح نہیں ہے۔ بے روح نماز کے متعلق کلام پاک میں ارشاد ہے۔ **فویل اللمصلین الذین ھم عن صلوٰتھم ساھون ط** یعنی افسوس ہے ان نمازیوں پر جو اپنی نمازوں سے غافل ہیں۔ ایک اور جگہ ارشاد ہے۔ **قد افلح المومنون الذین ھم فی صلوٰتھم خاشعون ط** (یقیناً وہ لوگ کامیاب ہوئے جو اپنی نماز میں خشوع اختیار کرتے ہیں۔ یعنی حق تعالیٰ نے ان نمازیوں کی تعریف فرمائی ہے جو خشوع اختیار کرتے ہیں۔ یہی خشوع حضور قلب کا مترادف ہے۔ ایسی ہی نماز کے تعلق حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے **الصلوٰۃ معراج المومنین ط** (نماز مومن کی معراج ہے) دوسری حدیث ہے۔ **لاصلوٰۃ الا محضور القلب** (نہیں ہوتی نماز حضور قلب کے بغیر) یہی حضور قلب روح عبادت ہے جس کو عرف عام میں ''طریقت'' بھی کہتے ہیں۔

حضرت جنید بغدادیؒ سے کسی نے دریافت کیا کہ حضرت سجدہ کے کیا شرائط ہیں۔ فرمایا ہمارے لیے یا تمہارے لیے۔ سائل نے عرض کیا دونوں کے متعلق ارشاد فرمائیے۔

آپ نے جواب دیا کہ تمہارے لیے سجدہ کی شرط یہ ہے کہ پیشانی اور ناک زمین پر لگ جائے۔ صوفیائے کرام کا سجدہ یہ ہے کہ جب ایک مرتبہ زمین پر سر رکھ دیا جائے تو پھر اٹھایا نہ جائے حتیٰ کہ موت آجائے۔

آں سجدۂ کہ تن نہ زسر می شود جدا

در کشورِ وفا گنہش نام کردہ اند

(ایسے سجدہ کو جس میں سر جسم سے جدا نہ ہو جائے وفا کی دنیا میں گناہ کہا جاتا ہے)

یا یہ شعر

نمازِ زاہداں سجدہ سجود است

نمازِ عاشقاں ترک وجود است

(زاہدوں کی نماز محض سجدہ سجود ہے لیکن عاشقوں کی نماز ترکِ وجود ہے)

اس طرف اشارہ کرتا ہے:

ان المصلین کثیر و المقیمین لھا قلیل۔

یعنی نماز پڑھنے والے تو بہت ہیں لیکن نماز کو قائم رکھنے والے بہت تھوڑے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز ''پڑھنا'' اور نماز کو ''قائم رکھنا'' دو مختلف چیزیں ہیں یہی نماز کو ''قائم رکھنا'' نماز کی اصل ہے خداوند قدوس نے اسی خصوصی اعتنا اور توجہ تام کو نماز کی روح قرار دیا ہے۔ **اقم الصلوٰۃ لذکری** (نمازِ قائم کرو میری یاد کے لیے)

اس طرح نماز کی ایک شکل تو یہ ہے کہ جس کے متعلق خداوند کریم نے فرمایا کہ ایسی نماز منہ پر ماردی جائے گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ارکان ظاہری کے ساتھ قلب بھی خوفِ خدا اور عقوباتِ آخرت کے خیال سے معمور ہو۔ لیکن ارفع ترین شکل وہ ہے جس کے متعلق حدیث شریف ہے کہ تم نماز اس طرح پڑھو گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو، ورنہ وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے۔

ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک

(تو اللہ کی عبادت یوں کر کہ گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے اور اگر ایسا نہ ہو سکے کہ تو اسے دیکھ رہا ہے تو البتہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔) اسی کو ''احسان'' کہتے ہیں جو عبادت کا اعلیٰ درجہ ہے۔

اسی طرح روزہ محض فاقہ ہے اگر وہ تقویٰ اور اس کے مقتضیات سے خالی ہے۔ خداوند کریم فرماتا ہے ۔ **یا ایھا الذین امنو کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون ط** (پ ۲ ع ۷)

ترجمہ: اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا۔ تا کہ تم متقی ہو جاؤ۔

یعنی ''متقی'' ہونا اصل مقصد ہے۔ حدیث شریف ہے ''کتنے روزہ دار ہیں جن کو روزہ سے بجز گرسنگی کچھ حاصل نہیں اور کتنے تہجد گزار ہیں جن کو نماز تہجد سے بیداری کے سوا کچھ فائدہ نہیں۔'' (ابن ماجہ)

ایک اور جگہ حضورؐ نے فرمایا ''بہت سے روزے دار ایسے ہیں جو روزے سے بھوک اور پیاس کے سوا کچھ نہیں پاتے۔''

روزے کی ارفع شکل کے متعلق مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

ہست روزہ ظاہر امساک طعام

روزۂ معنی توجہ واں تمام

ایں دہاں بندد کہ چیزے کم خورد

واں بہ بندد چشم وغیرے ننگرد

یعنی ظاہری روزہ یہ ہے کہ کھانا نہ کھایا جائے لیکن معنوی روزہ توجہ الی اللہ کا نام ہے۔ ظاہری روزہ دار منہ بند کر لیتا ہے۔ لیکن معنوی روزہ دار آنکھیں بند کر لیتا ہے یعنی وہ خدا کے سوا کسی کو نہیں دیکھتا۔

نماز اور روزہ کے متعلق یہ چند اشارات کیے گئے یہی حال تمام دیگر عبادات کا ہے۔

جو بندہ دین و دنیا دونوں میں سوائے اللہ کے کچھ نہیں دیکھتا اور ہر عبادت کی علت و غایت اللہ اور محض اللہ کو قرار دیتا ہے یقیناً وہ اور اس کی عبادت ہر حال میں ارفع و اعلیٰ ہے۔ عبادت کا یہی خلوص حقیقی تصوف ہے اور کوئی ہوشمند اس کی بلندی و برتری سے انکار نہیں کرسکتا۔

یہاں یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ ارکانِ ظاہری کسی اہمیت کے حامل نہیں۔ وہ اپنی جگہ حق ہیں اور ہزار مصلحتیں اپنے اندر رکھتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے بھی اختلاف ناممکن ہے کہ ''ارکان ظاہری اصل روح کے بغیر بے مقصد ہیں۔''

اسی جگہ یہ بات بھی واضح ہوجانا چاہیے کہ بعض لوگ ان تمام ارکانِ اسلام کی اصل روح کو تصوف سمجھنے میں کوئی اعتراض نہیں کرتے۔ نیز انسانیت کے اعلیٰ اوصاف مثل صبر و رضا، توکل و استغنا وغیرہ کو بھی داخل تصوف سمجھتے ہیں۔ لیکن جو اسلام کا اصل الاصول اور سب سے بڑا رکن ہے یعنی ''کلمہ توحید'' اس کے اسرار اور حقیقی معنی سن کر شکن بہ جبیں ہوجاتے ہیں۔ جس طرح تمام ارکانِ اسلام کا ایک باطن ہے۔ اسی طرح توحید کا بھی ایک باطن ہے اور وہ ہے ''وحدت الوجود'' اصل توحید ''وحدت الوجود'' ہی ہے۔ اگر توحید کو اس معنی میں نہ سمجھا جائے تو وہ توحید نہیں بلکہ ثنویت ہوجاتی ہے اور یہی حقیقی شرک ہے۔ جس سے بڑھ کر گناہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی نہیں۔ اس کی مزید بحث آگے آرہی ہے۔

تصوف پر اعتراضات

اسلامی تصوف پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں وہ کچھ اس نوعیت کے ہیں۔

(۱) تصوف شریعت سے کوئی مختلف شے ہے۔

(۲) حضور سرورِ کائناتؐ کے زمانہ میں یہ نام سننے میں نہیں آیا۔

(۳) تصوف کا ماخذ غیر اسلامی ہے۔ اس کا خیال ہندو ویدانت، بودھ مذہب یا یونانی فلسفہ سے لیا گیا ہے۔

(۱) پہلے اعتراض کا جواب کچھ حد تک پچھلی سطور میں آچکا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ اعتراض انتہائی نادانی اور تصوف سے لاعلمی کی وجہ سے ہے ورنہ صوفیائے کرام کا فیصلہ ہے کہ ''یہ دونوں علوم (شریعت و طریقت) آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ علم ظاہری باطن کے

بغیر جہالت اور نفاق ہے اور ظاہر کے بغیر علم باطن شیطانی وسوسوں میں پڑ کر جادۂ حق سے بھٹک جانا ہے'' (حضرت امام مالکؒ)۔ عالم اسلام کے جتنے مشہور صوفیائے کرام گزرے ہیں۔ خواہ وہ کسی بھی سلسلہ کے ہوں سب حد درجہ کے پابند شریعت تھے اور جزئیات تک میں شریعت سے تجاوز نہیں کرتے تھے۔ تاریخ اس کی شاہد ہے۔ مثالوں سے بات طویل ہوجائے گی۔

(۲) دوسرا اعتراض

یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں یہ نام کبھی نہیں سنا گیا۔ تصوف ہی پر کیا منحصر ہے اسلامی علوم کی جتنی بھی اصناف ہیں مثلاً فقہ، اقسام حدیث، تفسیر، علم الرجال وغیرہ اس زمانہ میں کوئی بھی اصطلاح رائج نہیں تھی۔ یہ سب اصطلاحات بعد کی پیداوار ہیں۔ اپنی سادہ شکل میں یہ سب چیزیں موجود تو تھیں لیکن نہ ان کی کوئی علمی شکل مدوّن ہوئی تھی نہ اصطلاحات کا جامہ ان کو پہنایا گیا تھا۔ اگر محض اس بناء پر ان تمام علوم کو رد کیا جائے تو اسلام کی پوری عمارت منہدم ہوجائے گی۔ حق یہ ہے کہ شمع رسالت اس زمانہ میں روشن تھی۔ آپ کا ارشاد ہی سب کچھ تھا۔ نہ کوئی اس زمانہ میں فقیہہ کہلاتا تھا نہ محدث، نہ مفسر اور نہ صوفی۔ شرف صحابیت سب فضیلتوں پر غالب تھی اور صرف صحابی کہہ دینے سے وہ محدث مفسر، صوفی سب کچھ بلکہ سب سے بالا و برتر ہوجاتا تھا۔ لیکن اس زمانہ میں بھی تمام صحابی ایک ہی مرتبہ اور ایک ہی خیال کے نہیں تھے اور کسی بھی معاشرے میں یہ ممکن ہے نہ ضروری۔ بلکہ معاشرہ کی فلاح اسی میں ہے کہ اس میں مختلف طبقۂ خیال کے افراد موجود ہوں۔ یقیناً اس جماعت میں اس زمانہ کے معیار کے مطابق طبیب بھی ہوں گے انجینئر بھی، شاعر بھی ہوں گے اور صحافی بھی۔ ماہرین جنگ بھی ہوں گے اور میدان سیاست کے شہسوار بھی۔ ظاہر ہے کہ اس میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جن کو عبادت سے زیادہ شغف ہوگا۔ اصحاب صفہ کا وجود اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ چنانچہ احادیث جو ہم تک پہنچی ہیں اس کے راوی تمام صحابی نہیں ہیں بلکہ چند مختص لوگ تھے اس کا مطلب یہ ہے کہ ان چند حضرات کو احادیث سے زیادہ لگاؤ تھا۔

اس کے بعد تابعین اور تبع تابعین کا دور بھی ایسا ہی تھا۔ اس دوران میں اسلام دور دراز ملکوں میں پھیلتا جا رہا تھا۔ اس کو ہر طرح کے سیاسی معاشرتی اور معاشی مسائل درپیش تھے۔ مقامی معاملات اور وقتی حالات سے اسلام چشم پوشی نہیں کرسکتا تھا اور بہت سے نئے نئے مسائل پیدا ہوتے جا رہے تھے۔ اسلام کی ہمہ گیری ان سب کو جذب کرتی جا رہی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کا ''سادہ اسلام'' بحالہٖ قائم رہنا مشکل تھا اور یہ سب قانون فطرت کے عین مطابق تھا۔ تبع تابعین کے سامنے ہی اور ان کے بعد اور زیادہ سیاسی افراتفری اس قدر بڑھ گئی کہ عبادت گزار اور مرنجاں مرنج قسم کے لوگ سیاست سے کنارہ کش ہوتے چلے گئے اور عزلت نشینی میں انہیں عافیت نظر آئی۔ دوازدہ امام کی مثال ہمارے سامنے ہے جو ظاہری اور باطنی علوم کے جامع تھے۔ اس قسم کے افراد اصطلاحاً صوفی کہلانے لگے۔ یوں بھی علوم اس قدر متنوع اور کثیر الجہت ہوگئے تھے کہ ایک فرد کا تمام علوم وفنون پر احاطہ کرنا محال تھا۔ زیادہ وسیع طریقہ سے اس کی مثال موجودہ زمانہ میں ہمارے سامنے ہے۔ ہر علم وفن کے ماہر الگ ہوتے ہیں اس طرح فقہ سے دلچسپی رکھنے والے فقیہہ، حدیث سے دلچسپی رکھنے والے محدث اسی طرح مفسر وغیرہ کہلانے لگے۔ زیادہ عبادت کرنے والے اور ہر شے میں اللہ کو دیکھنے والے صوفی کہلائے غرض اس زمانہ میں کسی اصطلاح کے نہ ہونے کا یہ قطعی مطلب نہیں ہے کہ وہ علم کسی شکل میں بھی پیشتر موجود نہ تھا۔

(۳) تیسرا اعتراض

یہ ہے کہ اس کے ماخذ غیر اسلامی ہیں۔ بالخصوص وحدت الوجود سے متعلق بعض خیالات ویدانت بودھ مت اور فلسفۂ یونان سے ماخوذ ہیں۔ یہ غلط فہمی اصل میں مستشرقین کی پیدا کردہ ہے۔ ہمارے یہاں کے مغرب پسند لوگ عام طور سے ان کی ریسرچ سے متاثر ہوتے ہیں اور اپنے علما اور فقہا کی تصنیفات پر نظر ڈالنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ مستشرقین کی ریسرچ، تعصب اور تنگ نظری سے خالی نہیں بلکہ عموماً اس میں در پردہ اسلامی دشمنی کا جذبہ کار فرما رہتا ہے۔ اپنے دامن کے موتیوں کو چھوڑ کر اغیار کی دریوزہ گری میں لوگ فخر محسوس کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں چند حقائق پیشتر بیان ہو چکے ہیں۔ مزید اگر بعض اساسی امور

ذہن میں رکھے جائیں تو یہ غلط فہمی آسانی سے دور ہوسکتی ہے مثلاً

وحدتِ دین

اسلام کا دعویٰ ہے کہ ایک ہی پیغام ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم النبیین حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم تک سنایا جاتا رہا ہے۔ انسانیت کی فلاح کے لیے پیغام خداوندی ہمیشہ پیغمبروں اور نبیوں کے ذریعے سے آتا رہا ہے۔ اسی لیے اسلام نے تمام پیغمبروں پر ایمان لانا ضروری قرار دیا ہے۔ ان تمام پیغمبروں کا دین ایک ہے۔ ان کی تعلیم ایک ہے۔ قرآن پاک کی متعدد آیات ہیں جن سے اس وحدت رسالت کا مفہوم ثابت ہے مثلاً **ولکل قوم ھاد ط** (ہر قوم میں ہدایت کرنے والے (بھیجے گئے) ہیں۔ **لاتفرق بین احد من رسلہ** (ہم خدا کے فرستادوں میں کوئی فرق نہ کریں) ایک جگہ ارشاد ہے۔ **وجعلنا ھم ائمۃ یھدون بامرنا**۔ (ہم نے انبیا کو پیشوا بنایا کہ وہ ہمارے حکم کی رہنمائی کرتے ہیں)۔

اسی طرح قرآن پاک سے پہلے کی کتابوں کو ماننے کا ہم کو حکم دیا گیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

والذین یومنون بما اُنزل الیک و انزل من قبلک ط (اور متقی لوگ وہ ہیں جو ایمان رکھتے اس کتاب پر جو آپ پر اتاری گئی اور ان کتابوں پر جو آپ سے پہلے اتاری گئیں) دوسری جگہ ارشاد ہے۔

مصدق المابین یدیہ وھد و بشریٰ للمومنین ط (البقرہ رکوع ۱۲) (قرآن پچھلی وحیوں کی تصدیق کرنے والا ہدایت کرنے والا ہدایت نامہ ہے اور ضمیر و ایمان رکھنے والوں کے لیے بشارت اور مژدہ ہے) یا ایک جگہ اوز ارشاد ہے۔

وانزلنا الیک الکتٰب باالحق مصد قالمابین یدیہ من الکتاب مھیمنا (مائدہ) (ہم نے تمہاری طرف کتاب حق کے ساتھ اتاری یہ ان تمام کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے کی ہیں اور وہ ان کی محافظ ہیں)

اس جگہ ایک نکتہ کا اظہار ضروری ہے۔ قرآن پاک نے ہمارے سامنے دو لفظ پیش کیے ہیں ایک ''دین'' دوسرا ''شرعتہ'' دین سے مراد وہ امور ہیں جن پر تمام مذاہب متفق

ہیں۔ مثلاً وجود باری تعالیٰ، توحید خداوندی اس کی الوہیت اور اپنی عبودیت، اللہ کی عبادت، جزا اور سزا، اچھے اور نیک اعمال کی تعریف اور اس پر عمل کا حکم اوصاف ذمیمہ سے اجتناب کی تاکید وغیرہ وغیرہ ایسے امور ہیں جن سے کسی مذہب کو اختلاف نہیں ہے اور تمام انبیاء بلالحاظ زمان و مکان اسی پیغام کو بار بار دہراتے رہے۔ اگر اس میں کچھ اختلاف ہے تو وہ تحریف یا تعبیر کی غلطی کی وجہ سے ہے۔

دوسری چیز ''شرعتہ'' سے مراد وہ جزئی اور فروعی احکامات ہیں جو زمان و مکان کے مخصوص حالات کے باعث تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔

غرض اسلام ان مذاہب کے اصل اصولوں کی تردید نہیں کرتا بلکہ اس کا اعلان ہے کہ وہ سب حق تھے۔ اگر غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہوگی کہ یہ ارتقائی عمل ہے۔ انسان کی ذہنی استعداد ہمیشہ سے اتنی پختہ نہیں تھی بلکہ رفتہ رفتہ اس بام کمال تک اس کی رسائی ہوئی ہے۔ خداوند کریم نے اسی استعداد کے مطابق آہستہ آہستہ انسان کو اپنا پیغام پہنچایا۔ جب ایک کو وہ سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے قابل ہوا یا اس میں لوگوں نے تحریف کرنا شروع کر دی تو دوسرا پہلے سے زیادہ اور اس سے بہتر سبق دیا۔ اس طرح تدریجی طور پر اللہ کے پیغام اس کے کسی مقرب بندے کے ذریعے اس دنیا میں آتے رہے جس کو ہم نبی یا پیغمبر کہتے ہیں۔ یہ ارتقائی عمل ہزارہا سال جاری رہا اور انسانی اذہان پختہ سے پختہ تر ہوتے رہے۔ جب خداوند قدوس نے یہ محسوس کرلیا کہ اب انسان اپنے شعور و ادراک میں مکمل ہوگیا ہے تو اس نے اپنا آخری پیغام اپنے آخری نبی حضرت ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے بھیجا اور یہ توثیق کر دی کہ یہ پیغام آخری اور کامل ہے۔ آئندہ دنیا کو مزید پیغام کی ضرورت نہیں رہی۔

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی (مائدہ۔ رکوع۔ ۱)

(آج ہم نے تمہارے دین کو تم سب لوگوں کے لیے مکمل کر دیا اور ہم نے تم پر اپنی نعمت پوری کر دی)

یہ آخری پیغام ہر طرح مکمل تھا اور اس کا نام ''دین اسلام'' بھی اللہ ہی نے تجویز فرما

دیا گویا اسلام وہی دین ہے جسے ابتدائے آفرینش سے اللہ کے ایلچی عالم انسانیت تک پہنچاتے رہے تھے۔ بقول کسے

دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

انبیائے کرام انسانوں کی ذہنی صلاحیتوں کے مطابق تھوڑا تھوڑا سبق دیتے رہے اور انسانی اذہان کو ایک بڑی اور بہتر چیز کے لیے تیار کرتے رہے یہاں تک کہ وہ بڑی اور بہتر چیز اپنی مکمل ترین شکل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کی۔

گزشتہ سطور سے یہ بات واضح ہوچکی ہوگی کہ اسلام گزشتہ پیغمبروں کے پیغامات کی انتہائی ترقی یافتہ اور مکمل اصلاح شدہ شکل ہے۔ لہٰذا یہ ماننا پڑے گا کہ پچھلے مذاہب اور اسلام میں کسی قدر مماثلت ناگزیر ہے۔ فرق صرف تفصیل اور درجہ کا ہے۔ اسلام میں ہر چیز اپنی بہترین اور مکمل ترین شکل میں ہے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھیے کہ ایم اے کا طالب علم اپنے خاص مضمون کو متعدد اصطلاحات کے ساتھ ابتدائی درجوں میں بھی پڑھتا ہے فرق صرف درجہ و تفصیل یعنی معیار کا ہوتا ہے۔ لہٰذا صرف اصطلاحات اور نفس مضمون کی اس مماثلت کے باعث کسی طالب علم کا یہ تصور نہایت احمقانہ ہوگا کہ اس کا مضمون دیگر جماعتوں کی کتابوں سے لیا ہوا ہے۔

یہاں ہمیں صرف توحید کا ذکر کرنا ہے۔ توحید تمام مذاہب کی اساس ہے۔ ہر آسمانی کتاب نے توحید کی تعلیم پر خاص زور دیا ہے۔ تحریفات کے باوجود ان کتابوں میں توحید کے دھندلے نقوش مل جاتے ہیں۔ لیکن تمام دوسرے عقائد کی طرح اسلامی توحید کی شکل اکمل ترین ہے۔ جس کو اصطلاحاً ''وحدت الوجود'' کہتے ہیں۔ اب اگر اخلاقیات کی طرح اسلامی توحید اور دیگر مذاہب کی توحید میں کچھ مماثلت نظر آتی ہے تو اس میں تعجب کی کون سی بات ہے اور صرف اس بناء پر یہ کہہ دینا کہ یہ توحید سرے سے اسلامی چیز ہی نہیں ہے۔ حد درجہ کی ہٹ دھرمی ہے۔ اپنے اصلی ہیرے کو ایک سنگ ریزے سے مشابہت کی بناء پر اپنے خزانے سے الگ کر دینا کوئی دانش مندی نہیں ہے۔

واضح رہے کہ اسلامی توحید اور دیگر مذاہب کی توحید میں (اکثر اوقات مترجمین کی

غلطی سے) بعض اصطلاحات اور الفاظ مشترک مل سکتے ہیں اور نفس مضمون میں بھی قدرے مماثلت نظر آ سکتی ہے لیکن بنیادی طور پر اسلامی توحید کافی مختلف اور کہیں اعلیٰ ہے۔ جس کا جواب دوسرے مذاہب پیش نہیں کر سکتے۔ دراصل اسلامی توحید کے متعلق اکثر حضرات زبردست غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں۔

اس کے اسباب حضرت مولانا محمد علی میکش نیازی اکبر آبادی کے نزدیک مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) ''اسلامی اور غیر اسلامی مابعد الطبیعیات کے فرق پر توجہ نہ کرنا۔''

(۲) ''بعض الفاظ اور اصطلاحات کا یکساں ہونا مثلاً فنا، انانیت، ہمہ اوست وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو ہندی اور اسلامی تصوف میں کسی نہ کسی صورت میں برابر استعمال ہوتے ہیں اور جب تک ان الفاظ کی معنوی تفصیلات معلوم نہ ہوں بہ ظاہر ان کا فرق محسوس نہیں ہوتا۔''

(۳) ''تیسری وجہ اس غلط فہمی کی یہ ہے کہ بعض غیر صوفی حضرات کو صوفی سمجھ کر ان کے عقائد کو صوفیوں کے عقائد سمجھ لیا گیا ہے۔ اس ضمن میں ملا ہادی کے علاوہ شیخ الاشراق کی مثال پیش کی جا سکتی ہے۔''

(۴) ''تصوف کے متعلق غلط فہمیوں کے اسباب میں ایک نظریہ شہود بھی ہے۔ اس غلط فہمی کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ نظریۂ شہود کے حامیوں نے کسی وجہ سے اس خیال کی شدت سے اشاعت کی کہ نظریہ شہود ہی خالص اسلامی ہے اور اس کے علاوہ جو صوفیانہ مسلک ہیں وہ سب اسلامی تعلیم کے خلاف ہیں اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ مغربی محققین نے اس نظریہ کو خالص اسلامی تصوف تسلیم کرتے ہوئے اسی کو اپنے مطالعہ و تحقیق کا موضوع قرار دیا ہے اور جب ان کی تحقیق کے نتیجے میں یہ نظریہ ویدانت سے مماثل ثابت ہوا تو ایک تو یہ غلط فہمی پیدا ہوئی کہ تصوف سرے سے ہی اسلامی مزاج کے خلاف ہے اور دوسرے یہ کہ اسلامی تصوف کا ماخذ ویدانت ہے۔'' (نقد اقبال)

ہمارے دینی ادب میں اس موضوع پر کافی مواد موجود ہے اور مفکرین اسلام نے بہت مدلل اور متحقق طور پر ہمارے مذہب اور ہماری توحید کی برتری ثابت کی ہے۔ تحقیق

کرنے والا خود اس حقیقت تک پہنچ سکتا ہے۔ بشرطیکہ عدل کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ اس مختصر مقالہ میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ تفصیل سے ویدانت، نوفلاطونیت یا بدھ مذہب کے نظریات توحید کو پیش کیا جائے اور پھر موازنہ کرکے اسلامی نظریات یعنی ''وحدت الوجود'' کی فوقیت اور بالادستی کو ثابت کیا جائے۔ یہاں صرف دو اقتباسات پیش کیے جاتے ہیں جو باوجود مماثلت اسلامی وحدت الوجود کی برتری ثابت کرتے ہیں۔

پہلا اقتباس حضرت شاہ مولانا محمد علی میکشؔ اکبر آبادیؒ کی کتاب ''نقد اقبال'' سے ہے۔ حضرت مولانا موصوف ہندوستان کے مشہور محقق اور صاحب حال صوفی ہیں اور آپ کی کتاب ''نقد اقبال'' گو اقبالیات سے متعلق ہے لیکن اسلامی وحدت الوجود، شنکر کے ویدانت، نوفلاطونی نظریہ اور بودھ مذہب کے متعلق آپ نے بہت محققانہ اور عالمانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ بھارتی حکومت نے اس کتاب پر آپ کو انعام بھی دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''شنکر کے نزدیک یہ عالم دھوکا اور التباس ہے۔ یہ دھوکہ برہمہ پر عائد ہوا ہے۔ عالم ناپاک اور بے عقل ہے۔ شنکر کے متبعین نے صراحت سے بیان کیا ہے کہ اودّیا (جہل یا جہالت) عالم کی علت مادّی ہے اور علّت ہونے میں وہ بھی برہمہ کی شریک ہے۔ اسی طرح آناؔ یا خودیؔ بھی التباس بلکہ التباس کی اصل ہے۔ نوفلاطونیت بھی مادّے کو شر اور حقیقت اعلیٰ کا حجاب سمجھتی ہے اور حقیقت اعلیٰ کے تصور کی بنیاد مادّے کے ترک پر رکھتی ہے۔ اس طرح گویا مادّے کی غیریت تسلیم کرتی ہے اور ہندی ارباب فکر کی طرح آخری منزل فنافی اللہ کو ترجیح دیتی ہے یونانی فلسفیوں نے وحدت الوجود کی اس انداز سے صراحت کی ہے کہ اسے محض مادہ پرستی کے سوا کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ چنانچہ زےؔ فونیز اس مادّی دنیا ہی کو خدا تسلیم کرتا ہے۔ اسپونوزا بھی تقریباً اسی کا ہم خیال ہے۔ اس طرح گویا نز یہہ سے بالکل قطع نظر کرنا پڑتا ہے۔ ان مفکرین سے ماقبل متقدمین فلاسفہ کے یہاں وحدت الوجود کے معنی صرف یہ رہ جاتے ہیں کہ کائنات کا ہیولیٰ واحد ہے۔ وہ آگ ہو یا ہوا یا پانی ہو یا کچھ اور، اس

طرح خدا کا تصور کلی طبعی کی طرح ذہنی اور خیالی ہو کر رہ جاتا۔

وحدت الوجود کے یہ تمام تصورات حقیقت کو بطور کُل کے تسلیم کرتے ہیں۔ اس طرح یا تو عالم کے وجود کا انکار کرتے ہیں یا خدا کی انفرادیت کا انکار کرتے ہیں اور اسی طرح انسان کی انفرادی خودی کے منکر ہیں۔ ان کے خیال میں وحدت الوجود کا تصور ہی انفرادیت کی ضد ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلامی وجودی، وحدت الوجود کے ساتھ انسانی خودی اور خدا کی انفرادیت کے بھی قائل ہیں اور انفرادیت کو کلیت کی ضد نہیں سمجھتے۔ بہ ظاہر یہ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اسلامی مسلک کے تفصیلی مطالعے سے اس بات کی تصدیق ہو جائے گی۔

صوفیائے اسلام کا سب سے بڑا گروہ عالم کو معدوم یا فریب نظر نہیں مانتا بلکہ ان کے خیال میں عالم اور انسان عین حق یا مظہر حق ہے اور یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ قرآن سے اسی نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔ قرآن نے وضاحت سے کہا ہے کہ موجودات خارج اور ظاہر میں ہوں یا باطن میں زمانی ہوں یا مکانی سب کی حقیقت اللہ ہی ہے۔

''ھوالاول والآخر و الظاھر والباطن ط''

مزید وضاحت کے بعد پھر فرماتے ہیں۔

''وحدت الوجود کے ان مختلف مکاتیب خیال کے مطالعے سے ہمیں یہ بات معلوم ہوگئی کہ وجود کے واحد تسلیم کرنے میں جس طرح یہ تمام مختلف اہل فکر متفق ہیں اسی طرح وجود عالم اور انسانی خودی کے بارے میں یہ سب آپس میں مختلف ہیں۔ خصوصاً شری شنکر اور حضرت ابن عربی میں بڑا زبردست اختلاف ہے۔ شری شنکر عالم اور انسانی خودی کو شر، مایا اور التباس و جہالت اور برہمہ سے علیحدہ سمجھتے ہیں اور ابن عربیؒ اور ان کے متبعین عالم اور انسانی خودی کو عین حق اور ظہور حق سمجھتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ شری شنکر کا نظریہ نفی

خودی اور ترک عمل تک پہنچتا ہے کیوں کہ جب عالم دھوکا اور مجموعہ شر ہے تو اس دھوکے سے نجات حاصل کرنا اصلی نجات اور التباسی وجود کا فنا ہوجانا ہی آخری منزل کمال قرار دی گئی ہے۔'' (نقد اقبال)

دوسرا اقتباس اخبار روزنامہ ''جنگ'' سے ہے۔ سیّد محمد تقی صاحب نے ایک مضمون ''انا الحق اور مایا'' کے عنوان سے تحریر فرمایا تھا۔ سید محمد تقی صاحب پاکستان کی مشہور شخصیت ہیں۔ تصوف میں نہ سہی لیکن فلسفہ میں آپ کا مقام ملک میں مسلم ہے۔ یہ مضمون براہ راست تصوف سے متعلق نہیں ہے۔ لیکن مسلم اور ہندو کلچر کے نظریاتی تصادم کی بنیاد پر لکھا گیا ہے اور ضمناً اسلامی وحدت الوجود کی برتری اس سے ثابت ہوتی ہے۔ اس میں صرف ہند ویدانت کا ذکر ہے۔ دیگر مذاہب کا نہیں۔

انا الحق اور مایا

مسلم اور ہندو کلچر کا نظریاتی تصادم

مشرق وسطیٰ کی نووارد تہذیب اور ہندو تہذیب کے لین دین کے سلسلے میں بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ تصوف ویدانت سے ماخوذ ہے۔ بلکہ جدید عہد کے ہندو اہل قلم کی رائے تو یہ ہے کہ تصوف کی تمام تحریکیں چاہے وہ مشرقِ وسطیٰ میں ابھری ہوں یا عیسائی دنیا میں ویدانت سے پیدا ہوئی ہیں۔ یہ رائے تاریخی تقاضوں کی روشنی میں صحیح نہیں ہے۔ تاریخ جس نہج پر چلی ہے اس کے تحت ہوا یہ کہ یکساں حالات نے یکساں ردعمل پیدا کیے ہیں۔ تصوف سماجی زندگی کے ایک خاص قسم کے ردعمل سے ابھرا ہے[1] اور مختلف معاشروں میں اس نے مختلف روپ اختیار کیے لیکن تصوف یا تصوف کی وہ قسم جو

---

[1] یہاں ہمیں اختلاف ہے۔ ہمارے نزدیک تصوف کوئی تحریک نہیں ہے بلکہ وہ عین اسلام ہے اور اتنا ہی قدیم ہے جتنا خود اسلام البتہ جزوی یا فروعی احکام میں فقہ اسلامی کی طرح حسب ضرورت تصوف اسلامی کی فروعات میں بھی حذف و اضافہ ہوتا رہا ہے۔ مگر بنیادی اصول بالخصوص توحید سے متعلق جو پہلے تھے وہ آج بھی ہیں۔ حالانکہ مسلمانوں کے معاشرے کا روپ ہمیشہ بدلتا رہا ہے۔

مسلمانوں میں موجود ہے ویدانت سے مختلف ہے ان دونوں میں چند بنیادی باتوں میں اختلاف موجود ہے۔ اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں کہ تصوف ویدانیت سے پیدا ہوا ہے۔ ویدانت اس کائنات کو دو حصوں میں بانٹتا ہے جن میں سے ایک حقیقت اصلیہ اور دوسری مایا یا سراب ہے ویدانت کی یہ دوئی تصوف میں موجود نہیں۔ تصوف کا فلسفہ وحدت الوجود سے پیدا ہوا ہے جس میں وجود کی وحدت ایک جوہری اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ تصوف کو اس بات پر اصرار ہے کہ یہ کائنات صرف ایک ہی وجود ہے۔ دو وجودوں میں منقسم نہیں ہے۔ اس جوہری فرق کا عملی نتیجہ بھی برآمد ہوا۔ جو تاریخی اعتبار سے بڑا اہم ہے۔ نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ مثلاً اگر وحدت الوجود کے فلسفہ کی رو سے ''انا الحق'' کہنا ممکن ہوسکا یعنی یہ کہنا ممکن ہوا کہ دنیا کی ہر چیز پر ذات باری کا اطلاق ممکن ہے تو ویدانت کی رو سے یہ سب کچھ کہنا ممکن نہ ہوسکا۔ ویدانت فلسفہ کائنات کو دو حصوں میں بانٹتا ہے ایک حصہ مایا ہے۔ یہ مایا برہمہ یعنی حقیقت اصلیہ سے جدا اور غیر حقیقی ہے اور اس لیے یہ ممکن نہیں کہ ویدانت کے تحت انا الحق کا نعرہ لگایا جاسکے ایک وہ شخص جو وحدت الوجود پر اعتقاد رکھتا ہو ہر متغیر حسن میں ذات حقیقی کا جلوہ دیکھ سکتا ہے مگر حسن ظاہری کو مایا خیال کرنے والا اس حسن سے نفرت کرے گا۔ اس سے دور رہے گا۔ گویا عملی فرق صرف یہ ہوا کہ ویدانت اس دنیا سے فرار کے اصول پر چلتا رہا جب کہ تصوف ساری دنیا کو برتنے اور اپنانے پر اصرار کرتا رہا۔ دونوں کا فرق صرف اتنا بنیادی ہے کہ اس کی موجودگی میں ویدانت اور تصوف کو ایک ہی تحریک کہنا تاریخی منطق کی رو سے صحیح نہ ہوگا اور اس سے یہ نظریہ کہ ویدانت کے اثر سے تصوف کی تحریک پیدا ہوئی ہے بے بنیاد قرار دیا جائے گا۔''[1]

---

[1] روزنامہ ''جنگ'' کراچی مورخہ ۲۷ نومبر ۱۹۶۵ء)